# گلاسکو اور ڈاکٹر مجید چوہدری

میرے سامنے Royal College of Physicians and surgeons of Glasgow کے صدر کا خط پڑا ہوا ہے۔ اس حد درجے محترم ادارے کے سربراہ کا نام Michael J Mckirdy ہے جو سرجری کے پرخار اور مشکل راستے کا مستند نام ہے۔ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ اس مکتوب میں کیا لکھا ہوا ہے۔ دراصل مائیکل میکرڈی نے پروفیسر ڈاکٹر عبدالمجید چوہدری کو مودبانہ التجا کی ہے کہ وہ گلاسکو کی اس عظیم درس گاہ میں تشریف لائیں کیونکہ ادارے نے انہیں اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ بھی درج ہے کہ یہ فیصلہ مجید چوہدری کی سرجری کے میدان میں حد درجہ اعلیٰ کارکردگی اور کینسر کے مریضوں کی مفت تشخیص کے اعزاز میں دیا جائے گا۔ مکتوب 24 جولائی 2024ء کو مجید چوہدری صاحب کو لکھا گیا۔ میری دانست میں یہ بلند و بالا اعزاز بین الاقوامی سطح کا ہے اور کسی بھی ڈاکٹر کو عطا کیا جانا بہت بڑا اعزاز ہے۔ گزارش کروں گا کہ یہ ہمارے ملک کے ذہین اور بے لوث افراد کے لئے بھی ایک تمغہ ہے جس پر پورے ملک کو فخر کرنا چاہئے۔ میں اس طرح کے تمغوں کی بات نہیں کر رہا جو ہماری حکومت نے چند ایسے افراد کو دیئے ہیں جو نا روے اور اپنے ملک میں مالی فراڈ میں ملوث ہیں۔ یہ ایک بین الاقوامی سطح کا وہ تمغہ ہے جسے حاصل کرنا ہر ایک کے خواب میں تو ہو سکتا ہے مگر مجید چوہدری صاحب نے اپنی محنت اور پیشہ ورانہ دیانتداری کی بدولت اس خواب کو ممکن بنایا۔

جب 1978ء میں کنگ ایڈورڈ کالج میں داخلہ ملا تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ کتنی قابل قدر درس گاہ میں داخل ہو رہا ہوں۔ اس زمانے میں پرنسپل' ڈاکٹر سیال صاحب تھے جو گائنی کے شعبے میں حرف آخر گنے جاتے تھے۔ پچھلی صدی کی بات کر رہا ہوں۔ اس شخص کی قابلیت کا اندازہ لگائیے کہ شہنشاہ ایران کے بچوں کی ولادت' ڈاکٹر سیال کی نگرانی میں ہوئی۔ رضا شاہ پہلوی بادشاہ تھا اور اس کے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ اپنے بچوں کی پیدائش کے لئے' دنیا بھر سے ہر طرح کے ڈاکٹر بلوا سکتا تھا۔ مگر ڈاکٹر سیال جیسا قد آور ڈاکٹر' اس وقت پوری دنیا میں موجود نہیں تھا۔ شاہ ایران' انہیں تہران بلانے کے لئے اپنا خصوصی طیارہ بھجوایا کرتا تھا۔ اندازہ کیجئے کہ پاکستان کے ڈاکٹر اس سطح کے تھے کہ پوری دنیا میں ان کی قابلیت کا ڈنکا بجتا تھا۔ بات صرف ایک ڈاکٹر پر ختم نہیں ہوتی۔ پروفیسر ایچ ایچ مرزا' ڈاکٹر اختر' سرجن گردیزی' سرجن رشید اور ڈاکٹر علی قلی خان جیسے نمایاں ستارے میو ہسپتال میں حد درجے محدود وسائل کے ساتھ لوگوں کی خدمت کر رہے تھے۔ کئی اساتذہ کے نام فراموش کر چکا ہوں۔ اور اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ ایم بی بی ایس کے پہلے دو سال اناٹامی کی پروفیسر طقیہ اور فیزیالوجی کی شفیق پروفیسر کے زیر سایہ گزرا۔ یہ دونوں خواتین اپنے مضامین میں یکتا تھیں۔ تیسرے سال میں جب وارڈ شروع ہوئے یعنی طالب علموں کو مریضوں کے ساتھ براہ راست رابطے میں کیا گیا۔ تو ایک چھبیلہ نوجوان جو حالیہ لندن سے پڑھ کر آیا تھا۔ سرجری کے میدان کی روح رواں نظر آیا۔ اس نوجوان کا نام ڈاکٹر مجید چوہدری تھا۔ اس وقت وہ اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ لیکن اپنے کئی شاگردوں سے بھی کم عمر نظر آتے تھے۔ اچھی طرح یاد ہے کہ چوہدری صاحب حد درجے محنت سے میڈیکل سٹوڈنٹ کو سرجری کی باریکیاں سمجھاتے تھے۔ عجیب زمانہ تھا پروفیسر ڈاکٹرز' پرائیویٹ پریکٹس کو اہمیت دینے کی بجائے میو ہاسپٹل کے عام مریضوں کو توجہ سے دیکھنا افضل سمجھتے تھے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ اس زمانے کے نامور ترین ڈاکٹرز' صبح اور شام یعنی دو وقت' اپنے وارڈ کے ہر مریض کو دیکھتے تھے۔ اگر مریض کی تھوڑی سی حالت بگڑ جائے تو پروفیسر ڈاکٹر صاحبان' ہاؤس آفیسرز کو اس بری طرح لتاڑتے تھے، جونیئر ڈاکٹر پوری پوری رات جاگ کر مریض کی دیکھ بھال میں جڑے رہتے تھے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان عظیم ڈاکٹروں نے نجی پریکٹس یا دولت کا انبار اکٹھا کرنے کی بجائے' انسانیت کے غریب ترین لوگوں کی مدد کرنا اپنا شعار بنائے رکھا۔ آپ ششدر رہ جائیں گے کہ پروفیسر ڈاکٹر عیس محمد نجی پریکٹس کرتے ہی نہیں تھے۔ صبح وارڈ کے مریضوں کو گھنٹوں دیکھنے کے بعد وہ شام کو طالب علموں کو دوبارہ بلا کر پڑھانا شروع کر دیتے تھے۔ میری ان سے ملاقات بہاولپور میڈیکل کالج میں بھی ہوئی۔ جہاں میں ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ڈاکٹر عیس محمد کے غریب لوگوں کو مفت دیکھنے کے اطوار بالکل اسی طرح موجود تھے جو میں نے ان کی جوانی میں ملاحظہ کیے تھے۔

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں جس قدر شاندار اساتذہ سے پڑھا اور سیکھا' وہ بیان سے باہر ہے۔ ہمارے کالج کا انتظامی دفتر پٹیالہ بلاک تھا۔ یہ انتہائی خوبصورت عمارت ریاست پٹیالہ کے شاہی خاندان کے سرمائے سے تعمیر ہوئی تھی۔ پرنسپل صاحب کا آفس بھی اسی دیدہ زیب بلڈنگ میں تھا۔ قدیم ترین لکڑی کی بل کھاتی ہوئی سیڑھیوں سے اوپر جا کر دائیں ہاتھ پر پرنسپل صاحب کا پرشکوہ آفس تھا۔ کسی طالب علم کی ہمت تک نہیں تھی کہ وہ پرنسپل کے دفتر کے سامنے سے گزر سکے۔ پٹیالہ بلاک آج بھی اسی شان و شوکت سے موجود ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ یہ ایک تعمیراتی شہکار ہے تو بات نامناسب نہیں ہوگی۔ ویسے عجیب بات ہے کہ اتنا خوبصورت دفتر' کسی بھی وزیر اعلیٰ کی نظر سے کیسے بچ گیا۔ کیونکہ ہمارے وزرائے اعلیٰ تو اچھے دفاتر پر زبردستی قبضہ کرنے کے ماہر گردانے جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال نوے شاہراہ قائداعظم ہے جو دراصل فری میسن ہال کی عمارت ہے۔ اس کے اندر لاہور میں موجود یہودیوں کی عبادت گاہ ہوا کرتی تھی۔ یہ بلڈنگ اپنی آب و تاب کے ساتھ آج بھی انسان کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ مگر ہماری ویژن ملاحظہ فرمائیے کہ ملک کے ایک انتظامی سربراہ نے نا صرف اسے دفتر بنا کر' اس کا بھرپور مذاق اڑایا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ پرشکوہ عمارت' ایک عجائب گھر بنا دی جاتی جو ملکی اور غیر ملکی لوگوں کیلئے توجہ کا باعث بنتی۔ مگر جس ملک میں ہر حکومت' اپنے آپ کو حرف آخر سمجھتی ہے، بالکل اسی طرح اس نایاب تحفے کو بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ کئی دہائیوں سے اب یہ وزیر اعلیٰ کا جزوی دفتر ہے۔

بات کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج اور اس کے انتظامی دفتر کی ہو رہی تھی۔ لہٰذا میں اپنے اصل مضموں پر ہی رہتا ہوں۔ پاکستان کے سب سے بڑے ہسپتال میں ستر اور اسی کی دہائی میں تمام مریضوں کو مفت دوائی مہیا کی جاتی تھی۔ انگریزوں کے زمانے کا ایک بہت بڑا کچن تھا جس میں مریضوں کے لئے صاف ستھرا کھانا بنتا رہتا تھا۔ اور باقاعدگی سے مریضوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ میو ہسپتال کے اندر ایک نجی ہسپتال بھی تھا جس کا نام ایلبرٹ وکٹر ہاسپٹل تھا۔ جو اے وی ایچ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بھلا زمانہ تھا۔ پرائیویٹ ہسپتالوں کے لالچ اور گھمنڈ سے ہزاروں نوری سال دور اے وی ایچ لاہور کا بہترین نجی ہسپتال گردانا جاتا تھا۔ صوبے کا گورنر تک اگر بیمار پڑتا تو وہ بھی اسی ہسپتال میں ایڈمیٹ ہوتا۔ طالب علم نے گورنر جیلانی کو' میو ہسپتال میں زیر علاج بذات خود دیکھا ہے۔ گورنر صاحب کا کمرہ بھی بالکل اسی طرح کا تھا جس طرح دوسرے نجی مریضوں کے لئے مختص تھا۔ کئی بار گورنر صاحب کو وہیل چیئر پر کمرے سے باہر آتے جاتے دیکھا تھا۔ مارشل لاء کے گورنر کی بات کر رہا ہوں۔ جو ہر طرح کے اختیارات سے لیس تھا مگر وہ پاکستان اور میو ہسپتال میں اپنا علاج کرانا اعزاز کی بات سمجھتا تھا۔ غور فرمائیے اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ واحد وجہ اس عظیم ہسپتال کے وہ عظیم ڈاکٹر تھے۔ یقین فرمائیے ان ڈاکٹروں میں کسی قسم کا کوئی احساس کمتری نہیں تھا۔ لیکن ان بھلے مانس لوگوں کے دو روپ تھے۔ مریضوں کے ساتھ حد درجہ شفیق اور طلبہ کے ساتھ حد درجے سخت۔ شاید ان فرشتہ نما اساتذہ کی سختی کی وجہ سے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے فارغ التحصیل ڈاکٹر پوری دنیا میں کامیاب ترین سمجھے جاتے ہیں۔ اور امریکہ تک میں آج بھی یہ لوگ اپنا لوہا' اپنی قابلیت کی وجہ سے منوا رہے ہیں۔

چھوٹے سے کالم میں اتنے بڑے موضوع کو ضبط تحریر میں لانا میرے لئے ناممکن ہے۔ یادوں کا ایک سیلاب ہے جس میں سے صرف ایک بوند آپ کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ بہت عرصے سے میو ہسپتال جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ معلوم نہیں آج کل کیا حالات ہیں۔ مگر یہ تو دور ابتلاء ہے جس میں پاکستان کا ہر ادارہ زوال پذیر ہے۔ موجودہ حالات سے تو لاعلم ہوں۔ شاید وہاں کا کوئی طالب علم یا پروفیسر موجودہ حالات پر مجھ سے بہتر روشنی ڈال سکے۔ مگر آپ ہمارے پرانے اساتذہ کی علمی قوت کا اندازہ تو لگائیں کہ گلاسکو کا ایک محترم ادارہ آج میو ہاسپٹل کے ایک عظیم فرزند' ڈاکٹر مجید اے چوہدری کو اعزاز سے نوازنے پر مجبور ہے!